

”ہاں بہت شور ہے مگر جلدی شاید آج جلدی ختم ہو جائے۔ کل تو باہر سے آتے ہوئے لیڈروں کی وجہ سے لمبا چکنا تھا۔“

”میاں مجھے تو جلدی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔“ رکے پھر بولے ”ہمارے زمانے میں بھی جسے ہوتے تھے شور ہوتا بھی تھا تو جسے سے پہلے مقرر سیٹھ پ آیا اور لوگ مودب ہو کر نہیں گئے کیا تہذیب بھی اُس زمانے کی۔

”وہ سکتا ہے۔ اب اجان تحریک خلافت کے زمانے سے ابھی تک باہر نہیں آئے ہیں۔“
گھر جب وہ یوں سوچ رہا تھا تو اسے رگا کہ جیسے وہ بھی اباجان کے تھیچے تھیچے گزرے زمانے میں چلا جا رہا ہے۔ کیا تہذیب بھی اُس زمانے کی۔ کبھی کوئی اپنی خی آوازیں بولا تو اباجان نے فوراً سرنش کی۔ میاں ہم اوپنچا نہیں سنتے۔ کبھی طاہرہ باجی نے تیر لجھیں بات کی تو بی انہاں نے ٹوکا دار سے لڑکی تیر سے ٹکے میں کیا چھٹا بانش رکھا ہے۔“ اور جب ساون ہمادی کی ترنگ میں طاہرہ باجی نے سیلیوں کے ساتھ ٹیکے ملے جھوٹے لئے تھے اور اپنی آواز میں ہنسی خیں تو بی انہاں نے فوراً لوک دیا تھا۔

”پیٹی یہ کیا ٹھیک مرے پھوٹ رہے ہیں۔“

ساون ہمادوں، جھولہ، گیت، پکی نیم کی بنولی —

”اچھا، ہم چلتے ہیں۔ نیند تو آتے گی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اباجان واپس جا رہے تھے۔ اور اب تم بھی آرام کر وہ۔“

اس نے ان کی بات سنی ان سی کی۔ ایک دور کی آوانا سے اپنی طرف گھنٹھ بھی تھی؛

پکی نیم کی بنولی ساون کب کب آفے گا

بیوں سوڑی مان کا جایا ڈولن بیچ بیاں کے گا

طاہرہ باجی اپنی سیلی کے ساتھ کتنے بلے ٹھیک ہوئے رہی تھیں اور صابرہ کتنی حسرت سے

اتھیں وکھر رہی تھی۔ اسی آن باورچی خاتے سے خالہ جان کی آوان آئی ”طاہرہ!“

”بھی۔“

”بیٹھی اک نک جھو لا جھولو گی۔ کڑھاتی ہے آسے بیٹھو۔ محتوا ی چھکتیں پکالو۔“
ٹا ہرہ باجی کے چلے جانے کے بعد وہ سلو کے پاس آیا ”سلو آؤ جھولا جھولیں۔“
جب وہ صابرہ کے ساتھ لگ کر جھولے میں بیٹھا تو رکا کہ نہ میں اس کے اندر آتی ہیں
ہے، اگلے ہی ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ اسی طرح جھولتا رہے۔ مگر صابرہ کھڑی میں تو لہ
کھڑی میں مانند ہے تم تیرے ساتھ نہیں جھولتے۔“ وہ اچانک جھولے سے انتہ پڑھی۔

”کیون؟“ ہٹا کر رہ گیا۔

”میں نہیں جھولتے۔“

وہ سیران اور اُداس کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے فربیب پہنچا۔
”رسلو۔“

”ہم تجھ سے نہیں بولتے۔“

صابرہ کو جب وہ کسی طور منانے پایا تو وہ اُداس دہاں سے چلا یلو ہی اس
کا رخ زینے کی طرف ہو گیا۔ زینہ چڑھ کر وہ اوپر کھلی چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کمی تھی۔
اور پونکہ زینہ کو بند ہرستے دیہ ہو جکی تھی اس لئے میں جم کمی تھی جیب سے چاقو کا وہ ٹوٹا
ہوا چھل زکالا جو پیش نیائے کے لئے جب میں رکھا کرتا تھا۔ جمی ہوئی مٹی پر نوک کو اس
طرح چلانا شروع کیا جیسے شکر پارے کاٹ رہا ہو۔ محتوا دیہ میں صابرہ یعنی بھکتی ہوئی
وہیں آپنی بڑی توجہ سے اسے شکر پارے کاٹتے دیکھتی رہی۔ مگر اب وہ اپنے کام
میں مصروف تھا۔ صابرہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ شکر پارے بناتے بناتے جب جی بھر
گیا تو اپنے ایک نئی مصروفیت پیدا کر لی۔ جہاں میٹی زیادہ خشک ہو گئی تھی وہاں اس
نے میٹی کو کریدا۔ محتوا اگر ٹھاہیں گیا تو اپنا ایک پاؤں اس میں رکھا اور کریدی ہوئی ساری
مٹی اس پہ جمادی۔ پھر آہستہ سے اپنا پاؤں نکال لیا۔ مٹی کا ایک غار سایں گیا۔ صابرہ بڑی

تو جہے سے دیکھتی رہی۔ پھر لوٹی یہ کیا ہے؟“
”قر،“ اس نے صابرہ کی طرف دیکھے بغیر پر تعلقی سے جواب دیا:
”یہ قبر ہے؟“ صابرہ نے یحربت سے پوچھا۔
”ہاں۔“

یحربت سے قبر کو دیکھتی رہی۔ پھر لوٹی اس طرح کہنے لگی میں گہری آگئی تھی۔ ”ذکر ہالے
لئے بھی قربنادے۔۔۔“

”خود بنائے“ اس نے روکھا ساجواب دیا۔

صابرہ اس کی طرف سے بیاں ہو کر اپنی قبر آپ بنانے کا یعنی کرنے لگی۔ مٹی یہت ساری
کھڑجی۔ کھڑجی ہوتی جگہ میں اپنا نگاہ پاؤں رکھا۔ پھر اس پکھڑجی ہوتی مٹی کو جمایا۔ پھر آہنگی سے
پاؤں نکالا۔ پاؤں نکالتے ہی مٹی کی چھت گردی۔ وہ اس کی ناگامی پر کھکھلا کر ہنسا۔ مگہ
صابرہ نے حوصلہ میں چھوڑا۔ دوسری دفعہ پھر اس نے کو شمش کی، پھر ناگام ہوتی تیسرا دفعہ
پھر کو شمش کی اور اس مرتبہ اس نے واقعی اتنی نفاست سے پاؤں باہر نکالا کہ مٹی کا
رینہ نک نہیں گرد۔ صابرہ نے اپنی کامیابی پہننا زکیا اور اس کی قبر پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی
قبر کو دیکھا:

”میری قبر اچھی ہے۔۔۔“

”ہوں بڑی اچھی ہے۔۔۔“ اس نے صابرہ کا منہ چڑایا۔

”پاؤں ٹال کے دیکھے۔۔۔“

اس تجویز پر وہ ٹھٹھکا۔ کچھ سوچا۔ پھر دھیرے دھیرے کر کے اس نے اپنا پاؤں ٹھٹھا
اور صابرہ کی قریں کھسکا دیا۔ پھر دل ہی دل میں قائل ہوا کہ سب سوچ کرتی ہے اور اپنا پاؤں
دیز نک اس نرم گرم قبر میں رکھے رہا۔

اس کے بعد اس کی طبیعت کا تکر رخود نخود دور، ہو گیا۔ صابرہ سے اس کے تعلقات

پھر سے خشکوار ہو گئے جب دوسری مرتبہ بنلتے بناتے صابو کی قبر ٹھے کئی تو اس نے
اپنے ہاتھوں سے اس کا گورا پاؤں صاف کیا۔ پھر حب سے سیدپ نکالی۔
”بلو سپی لے گی؟“

”ہاں ہوں گی۔“ اُس نے لچاٹی نظروں سے سیدپ کو دیکھا۔

سیدپ اُس سے لے کر صابو نے پٹیکش کی ”چل جھولا جھولیں۔“
چھت سے ٹھٹٹا ترستہ انہوں نے طاہرہ بائی اور سیلی کی آواز سنی:

اماں آڑو جامن گھلے دھرے

اماں میں نہیں کھاؤں میری ماں

اماں تتنا پانی بھرا دھرا

اماں میں نہیں نہاؤں میری ماں

اماں دھانی جوڑا سلا دھرا

اماں میں نہیں پہنؤں میری ماں

اماں ساجن ڈولائے کھٹا

اماں میں نہیں جاؤں میری ماں

وہ پلٹے اور پھر چھت پر آئیٹھے۔ اب کیا کریں۔ اس نے ایک نئی بجھیز پیش کی۔

”سلووا۔“

”ہوں۔“

”اوہ دو لمادا من کھیلیں۔“

”دو لمادا ہیں؟“ وہ سپٹا گئی۔

”ہاں جیسے میں دو لمادا ہوں اور تم دا من ہو۔“

”کوئی دیکھ لے گا۔“ وہ گھبرا گئی۔

بس اسی دم ایک دم سے ہادل گھم جا کہ دونوں ڈر کئے اور فوراً ہی ملنے اس زد سے

برسا کر کھلی چھت سے زینے نہ پنچتے پنچتے دونوں شرالویر ہو گئے۔

یمنہ کا آغاز لکھنا پر شور ہوتا۔ اندر باہر سب جگہ، بچل پیچ جاتی تکہ جب برسے ہی چلا

جاتا ایک ہی رفتار سے تو فضنا آہست آہستہ ادا سی سے بھر جاتی اور آوازیں خاموش ہوتی

چلی جاتیں۔ شام پڑتے کسی سور کی بھٹکی اواز دوست بھل سے آتی اور اداں برستی شام میں

اور اُوسی پھیلادیتی۔ پھر سات ہو جاتی اور یمنہ میں شرالویر تاریکی گھری اور دیز ہوتی چلی جاتی

رات کے پیچ جب کبھی انکھ کھلتی تو یمنہ اُسی طرح برس رہتا جیسے اذل سے بہس رہا ہے۔

اینکہ برستا رہے گا۔ وہ رات آوازوں سے لکھنی آباد تھی۔

وکیو شام نیتیں آتے، گھیری آتی بدھی

اک تو کاری رات انھیڑی بیکابر سے یہڑی بیڑی

نینان نیند نہ سہلتے، گھیری آتی بدھی

گھن شام نیتیں آتے، گھیری آتی بدھی

”ار سے یہ ہند نیتیں آج کی رات سونے تھوڑا ہی دیں گی۔ اُپر سے میز برسے چلا

جا رہا ہے۔“

”ہی اماں یہ جنم اشٹھی کا ملنے ہے۔“ نظر یعنی بولنے وضاحت کی ملکھیا جی کے پوتھے

دل رہے ہیں۔“

”ار سے اب کھنھیا جی کے پوتھے دھل بھی چکیں۔ جل بھل تو ہو گئے۔“ ہی اماں نے
کھوٹ لے کر پھر سونے کی کوٹشش کی۔ بس اسی دم و سنتی کے چوباسے میں دھوکتے بھی۔

پانی بھرن گئی ساما جھنا کردا

رہیا میں مل گئے نشدلال

اے نندیا سوری روئے

اور کہیں دور سے آفاز آرہی تھی:

رتیا ہے مجھے دار سجن آئیو کہ جس ایتو
پنگ ہے بلکل اس سجن آئیو کہ جس ایتو
سارا میتہ جنم اشٹھی کی رات ہی کو پڑھتا تھا۔ صحیح جب وہ جاگا تو نہ بارش نہ بادل۔
اوگہ دسی پچھر روشنی روشن، دھلادھل۔ آسمان، پیڑ، بجلی کے کھمی، دیواریں،
منڈپیں۔

”ذا کر اچل پیر ہو ٹین پکٹیں۔“

پندو کی تجویز کے ساتھ وہ قوام ہر سے نکل پڑا اور یہ ہو ٹیوں کی تلاش میں کامے
مندر سے گزر کر کر بلانگ کیا۔ زمین و آسمان یہاں اس گھر طری کتے نہ م اور اجھے تھے اور خاص
یہں جا بجا کلتی ہی ہو ٹیاں رنگ رہی تھیں، نہ م نہ م محل جلی۔ انہیں چھونے میں اسے
کتنی لذت مل رہی تھی۔ نہ م چیزوں کو چھونے کو اُس کا ان دونوں لکنا جی چاہتا تھا۔ مگر چھو
جائتے پر ہی ہوتی پنجھ سیکھ ساکت ہو جاتی اور سری ہوتی بن جاتی۔ نہ م چیزوں چھو جانے
سے اتفاق کی کیوں ہیں، وہ سخت ہیزان ہوتا۔

”رسیلو! یہ دیکھو۔“

”ہانتے اتنی بہت سی پیر ہو ٹیں۔“، جیزت اور سرت سے وہ کھل اٹھی۔ اور پھر وہ اس
کے ساتھ کلتی گھل بل گئی۔ ایک دم سے کتنی قریب آ جاتی تھی، ایک دم سے کتنی دور پسلی
جاتی تھی۔

”سیلو! اس کھیلیں۔“

”د نہیں کھیلے۔“

”میرے پاس کوڑے تھیں ہیں۔“

”میں کیا کروں۔“

”بہ دیکھ، پھر کنی۔“

”ہوں۔“ اُس سے منہ چڑا دیا۔

پھر وہ اکیلا ہی پھر کنی پھر تاوہا، بہت دیر تک۔ پھر اپنی چکنی نکالی اور چکنی گھمانی شروع کردی چکنی گھمانے میں اُس سے لئنا مزا آتا تھا۔

شنتے ہیں بیلی کا یہ دستور تھا

چکنی گھما تے گھما تے ایک دم سے وہ چونکا مجھوں آگیا۔ اور چکنی کو جھول تیر کے موافق ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ جب وہ بھاگنک میں کھڑا تھا تو وہ کھا کر صابرہ بھی برابر آکھڑا ہوئی ہے ”ذاکرہ ای مجھوں ہے۔“

”اور کیا مجھوں تو ہے ہی۔“

گیویاں چاک، بیال بکھر سے ہوئے، ایک ہاتھ میں پیالہ، دوسرا ہاتھ میں اینٹ،

پیر میں زیجیر کہ پلنے میں بھن چھن کر رہی تھی۔ رک کر کہ کھڑا ہوا:

شنتے ہیں بیلی کا یہ دستور تھا

بھیک دینتی تھی جو آتا تھا گدا

ایک دن مجھوں بھی کاسہ ہاتھ لے

جا پکارا کچھ جھے لیںد دے

آئی بیلی اور سبھوں کو کچھ دیا

ہاتھ سے مجھوں کے کاستے لیا

سا تھہ ہی اینٹ زور سے مانچے پہ ماری کہ ما تھا خونم خون ہو گیا اور دھرام سے زمین پر

گز کر ساکت ہو گیا۔

”ذاکرہ ای مجھوں مر گیا؟“ وہ بڑی طرح کانپ رہی تھی۔

”رنہیں، مرا نہیں ہے۔“

”در نہیں، وہ مر گیا۔“ وہ روپیٹھی۔

”در اری پچلی اس نے مکر بھر رکھا ہے۔“

”نہیں، بخوبی مر گیا۔“ وہ روئے جادی تھی۔

بخوبی ایک دم سے اُنھوں کھڑا ہوا۔ وہ یزان رہ گئی۔ پیارہ سنہماں جس میں دیکھنے والوں نے کچھ پیسے ڈال دیے تھے، وہ آگے بڑھ لیا۔

”سیلو! تو نے بیل اب بخوبی دیکھا تھا؟“

”در نہیں، کیا ہوتا ہے اس میں؟“

”اس میں پاس طرزوپی بخوبی بتا ہے اور الہی جان بیلی بتتی ہے۔“

”پھر کیا ہوتا ہے؟“

”پھر پاس طرزوپی الہی جان پر عاشن ہو جاتا ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جھینپکئے۔ پھر فوراً ہبی صاحبہ کے تیور بدل

گئے۔ ”چل بے شرم، ابھی بتائی ہوں جا کے بی اماں کو۔“

”میں نے کیا کہا ہے؟“ وہ پھر آگیا۔

لگر ابھی بات بی اماں کو بتائی کیسے۔ بس اس سے روٹھ لئی اور دور دور پھر نے لگی۔ وہ خود جھینپا ہوا تھا۔ اس سے اُنکھے ملاتے جھلکتا تھا۔

”کوں باس، کوں باس،“ ایک دم اس کے کان کھڑے ہوتے۔ قریب اور دور سے آتی آوازوں کا اس پر عجیب اثر ہوتا تھا۔ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، وہ ان کی طرف کھنچا جلا جاتا تھا۔ ”کوں باس،“ یہ کیا لفظ ہے، یہ کبھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ جب وستی کے پتالا اللہ چونی مل چھت پر کھڑے ہو کر یہ صدائگاتے ہیں تو کوئے کہاں کہاں سے آکر ان کے سر پر منڈلا نے لگتے ہیں۔ وہ تیر کی طرح اپنی چھت پر گیا۔ یتھے یتھے

سامنے وستی کی جھٹ پر دو بڑی تلیں کچھی تھیں۔ ان پر دو دھیں پکے چاول رکھتے ہوتے
چاولوں پر کوئے لٹے پڑ رہے تھے۔ کوئی کوئی چیل منڈ لاقی آتی اور تلی پر جھپٹا مارتی لالہ
پونی مل کھڑے آواز لگا رہے تھے:

«کوں پاس، کوں باس»

اور چیل کوؤں کی ایک گھٹان سے سر پر چھاتی ہوتی تھی۔
«پتہ ہے کیا بات ہے؟» اُس نے صابرہ کی حیرت دیکھ کر اسے معلومات فراہم کرنے
کی ٹھانی درام چند رجی کی تلیں صاف ہو رہی ہیں۔»

«رام چند رجی کی تلیں؟» وہ اور سیران ہوتی۔

«ہاں اور کیا۔ جب رام چند رجی بھجوں کر کے چلتے تھے تو کوؤں کا راجہ آکے ان کا بھوٹا

کھاتا تھا اور پل صاف کرتا تھا۔»

«چل بھوٹے۔»

«اللہ قسم!»
«پوچھوں میں اماں سے؟» اور اس نے فوراً جاکر میں اماں سے کام میں پروردیا کہ ذا کمر کیا

کہہ رہا ہے۔
«یہی!» میں اماں نے اسے گھوڑے دیکھا۔ تو ہمارے گھر کیوں پیدا ہوا، اسی پہنڈو کے
گھر پیدا ہوا ہوتا۔ باپ ہر وقت اللہ رسولؐ کرے ہے پلوٹ کی خبر نہیں کہہ روانی قصوں میں

میں پڑا گیا ہے۔»

مگر میں اماں کا اب وہ چرم خم نہیں رہا تھا۔ پہلے ہی کی لراح سب پر روک لوک کہہ تی تھیں
ڈانٹ طوپٹ کرتی تھیں مگر آواز میں اب زیادہ دم نہیں رہا تھا۔ مر جھاکے بالکل مقابن گئی
تھیں جیسے دھیرے دھیرے ٹھے رہی ہوں۔ میں اب تو یہ دعا ہے کہ پلنگ پر پٹھک لگتے

سے پہلے اللہ مجھے اٹھا لے۔»

”اے بی اماں اکیا کہ مر ہی ہو۔ ابھی تو تمہیں پوتے کا سہرا دیکھنا ہے۔“

”اے شریفین بوا! ہڈی سے بڑا تو لگ گیا۔ اب یاں کیا اللہ یاں کی بوئیں سمجھنے کے لئے جیوں گی۔“

بی اماں بے شک بہت بھی پچلی تھیں۔ بتایا کہ تمہیں کہ ان کے پچپن میں صرف چھوٹی بزریاں میں رات کو ایک مثال جلتی تھی۔ باقی سب سڑکوں، گلیوں میں انہیں رپتا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے مثال رخصت ہوئی اور سڑکوں اور گلیوں میں لاٹیں نصب ہو گئیں اور اب ان کی جگہ کھڑے تھے اور سڑکوں پر جہاں تمہاں بجلی کی روشنی نظر آتی تھی۔ بجلی تو اب مسجد میں بھی لگتے گئی تھی مگر یہ تجھیں ابا جان نے کھنڈت ڈال دی۔ یہ بعut ہے۔ اور عصا لے کر مسجد کے دروازے پر پاسیاں بن کر کھڑے ہو گئے۔ فتنگ کرنے والے آئے اور بھر کی گھاکر چلے گئے۔ حکم بندے علی اور مشتی مصیب حسین نے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک ہی جواب دیا کہ ”یہ بدععت ہے۔“

پھر سے کے تیرے دن بی اماں کی طبیعت بگڑ گئی اور ایسی بگڑی کے سانس چلنے لگا۔ ابا جان پھر چھوڑ چھاڑ کھر آئے مگر بی اماں نے ان کے آنے کا انتظار نہیں کیا۔ اگئے دن جب ابا جان فخر کی نماز کے لئے مسجد پہنچے تو دیکھا کہ بسیلی لگ چکی ہے۔ یہ دیکھ اٹھے پاؤں آئے اور زندگی میں پہلی مرتبہ فخر کی نماز کھر پیدا کی۔ پھر وہ کبھی مسجد میں نہیں گئے اور کبھی نماز کھر سے باہر نہیں پڑھی۔ ہماری صحیح شام بی اماں کی قریب چاکے قرآن خوانی بہت دنوں تک کرتے رہے۔

ابا جان نے روپ نگوہ بیٹھی پر عنزوں کو روکئے کی کتنی کوششیں کی تھیں جنم پر جب تاشے بخنے لگے تھے تو انہوں نے منڈھے ہوئے تاشے پھاڑ دیتے:

”تاشا بخنا ازرو سے شریعت حرام ہے۔ میں اسے مجلسوں اور زیارتوں کے

ساتھ نہیں بجھنے دوں گا۔»

«مگر لکھنوں میں تو ہر زیارت کے ساتھ تاشے بجھتے ہیں۔»

«بجا تمیں لکھنوں والے نظریت کو ملنے کے تو بجا تمیں پیں۔»

اس برس تو تاشے کسی مجلس میں، کسی زیارت کے ساتھ وا قعی نہیں بجھے مگر لکھنوں آتے آتے ابا جان کا زور ٹوڑتے چکا تھا۔ ہر زیارت تاشوں کے ساتھ ملکی، سواتے اس زیارت

کے جو کھڑکی والے امام بالڑے سے نکلتی تھیں کہیہ اپنا خاندانی امام بالڑہ تھا اور اس پر ابا جان کا زور چلتا تھا اور پھر ہر زیارت کہ حضرت حکیمی، روپ نگر کے حرم کی سب سے خاموش زیارت مطہری۔ نہ تاشے، نہ فضول، نہ سوز خوانی کہ ابا جان سوز خوانی کو بھی شرع کے خلاف بتاتے تھے سوز خوانی کے خلاف بھی ابا جان نے عزادقائم کیا تو مقامگار اس محاذ کا

بھی وہی اسجام ہوا جو ان کے دوسرا سے عزادوں کا ہوا تھا۔

روپ نگر ابا جان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ یہ اماں اللہ کو بیاری ہو چکی تھیں اور بستی میں بھلی آگئی تھی۔ ابا جان بھلی کو مسجد میں آنسے سے نروک سکے جس طرح وہ ملائے کو حرم میں راہ پانے سے نروک سکے تھے۔ بھلی کے خلاف محاذ، زمانے کی یدعتوں کے خلاف ان کا آخری محاذ تھا۔ اس کے بعد وہ خانہ نشین ہو گئے۔ گھر ہی میں نماز ادا کرتے گھر ہی میں بیٹھ کر حرم کے دسوں دن گزارتے۔ پھر ایک روز انہوں نے جانماز پر بیٹھے بلیٹھے سفر کے لئے استخارہ کیا۔ استخارہ آگیا، سفر کا سامان ہونے لگا۔

«ای جان ہم جا رہے ہیں؟ یہی اماں کے گنڈر جلنے کے بعد اب وہ ہربات اسی سے پوچھتا تھا۔

«ہاں بیٹا۔» اسی نے افسر دیگی سے کہا۔ چپ ہوتیں، پھر آپ ہی آپ بڑا بڑا نہ لگیں۔

«اپ ہمارا بیہاں کیا رکھا ہے۔ زمینیں پہلے ہی ٹھکانے لگ کری تھیں۔

ایک ٹوٹا چھوٹا گھر رہ گیا ہے مگر خالی گھر کو لے کے چاٹنا ہے،»

”امی! ہم ویاس پور جا رہے ہیں؟“

”دہاں بیٹا! ویاس پور جا رہے ہیں۔ تمہارے پے چاتال نے تو سب ویاس پور ہی میں ہیں۔ لی اماں نے زمین کپڑی بھی، نہیں تو ہم تو پہلے ہی بیان سے چاچکے ہوتے۔“

”رامی! ویاس پور بست دو رہے؟“

”بیان دو رہتی ہے۔ بیان سے بلند شرستک تو لاری میں جائیں گے۔ وہاں سے ریل

میں سوار ہوں گے۔“

باہر اکھڑا تھا۔ اس کے تصور میں لاری بھی اور ریل بھی۔ وہاں جنی سواریاں جن میں اسے زندگی میں ہمیں مرتبہ سوار ہونا تھا۔ اسی جتنی اُد اس تھیں وہ اتنا ہی خوش تھا۔ سفر کرتے اور نئی بستی کو دیکھنے کا شوق اس کے بیان یک کاک جاگ اٹھتا تھا۔ صابرہ جملے کس وقت بیان اکھڑتی ہو گئی بھی اس سے دور کھڑتی وہ بندھتے ہوتے بستروں اور تالا لالکتے پکسروں کو تکے جا رہی تھی۔ تکمیر ہی، پھر اچانک پاس کھڑتی خالہ جان کے دامن میں منہ پچھا لیا اور سکیاں لینتے گئی۔ خالہ جان نے اس کے سر پہ ماند پھیرا اور بولیں:

”اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ خالہ بی جلدی واپس آئیں گی۔“

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں بھی انسو آگئے۔ اسی نے صندوق میں تالا لالکاتے لگاتے کہا۔

”صابرہ!“ رکیں، پھر بولیں:

”بیش امیں وہاں پہنچ کے جلدی تمہیں بلاؤں گی۔ بس تمہیں دیہیں رکھوں
گی اپنے پاس۔۔۔“

ابا جان نے بستر باندھتے باندھتے ایک نظر سکیاں بھرتی صابرہ کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں غرق ہو گئے۔

وہ دیکھتا رہا۔ اس کی ساری خوشی زائل ہو چکی بھی۔ ہمت کر کے آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا۔ ”سبو۔“

سابر منے بھیگے پھر سے کے ساتھ راتی دیر میں اس کے سارے گال آنسوؤں میں ترستہ تو
گئے تھے، اسے دیکھا اور ایک دم سے پھر منہ خالہ جان کے دامن میں پھیلا لیا اور پہلے سے ریادہ
شدت کے ساتھ سیکھاں لیئے لگی۔

”رمیاں ذاکرہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اباجان پھر اس کے کمرے میں چلے آئے تھے۔
”جی، کچھ نہیں،“ اس نے اس طرح کہا جیسے وہ پھری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے اور فراز
کتاب کھول کے سامنے رکھ لی جیسے جنار بنا ہو کر وہ اصل میں کتاب پڑھ رہا تھا۔
”کچھ تو ہوا ہے۔ بہت شور پڑا ہو ہے اور مجھے لگتا ہے کہ گولی چلی ہے۔ کچھ آواز
سی آئی تھی۔“

اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور سامنے جلسہ کاہ پر نظر ڈالی۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے
تھے اور نمرے لگا رہے تھے۔ کچھ رضا کار قسم کے نوجوان کھڑے ہو جانے والوں میں سے
کسی کو زبردستی بھانے کی اور کسی کو باہر ہو گیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یعنی جمع میں
دو ٹولیاں بننے لگی تھیں۔ پھر ایک دھماکہ ہوا۔ اس نے بزرگی کے ساتھ کھڑکی پند کی
اور واپس ہوتے ہوئے اباجان کو اطلاع دی:

”گولی نہیں چلی، پرانے چھوڑے چارہ ہے جا رہے ہیں۔“

”وہ کس خوبی میں؟“

”تاکہ جلسہ درہم بیدھم ہو جاتے۔“

”کیا ہو گیا ہے لوگوں کو؟“

”اباجان! آپ پر لشان نہ ہوں۔ یہ آج کل کے جلسہ کی یہی عتوں ہے۔ آپ ابہ موجاہین کی
”بیٹے تمہیں پڑھے کہ میری نیت ایک وفہ اچھت جاتے تو پھر مشکل، ہی ہے آئی ہے۔“

چپ ہوتے، پھر بڑھاتے:

”پاکستان پر اللہ رحم کرے۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟“

اوہ بڑا طبیعت تھے ہوتے ملک کے

اس سے اٹھ کر پھر کھڑکی بھوڑی بھول کر جان کا کھڑک سے لوگ بیٹھ گئے تھے۔ مگر شراب بھی بہت تھا۔ اس نے کھڑکی بند کی، بھلی گل کی اول استرپ جالیٹا۔
«لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟»

ابا جان کا فقرہ فہریں میں گو نجا۔ واقعی، لوگوں کو کیا گیا ہے؟ اس نے سمجھ دی گئی سے سوچا۔ گھروں میں، دفتروں میں، ریستورانوں میں، گلیوں بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقش تھا۔ بحث پہنچنے تطبیقی، پھر ذاتی، پھر توکار، پھر گام گلوچ، پھر سر پھٹول۔ راہ چلتے لوگوں کا ٹھنڈک کر کھڑک سے ہو جاتا، لڑنے والوں کو دہشت سنتا، پھر ایک دوسرے سے پوچھتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ ہر ایک کی اگھوں میں ایک خوف جیسے واقعی کچھ ہونے والا ہے۔ پھر اپنی راہ پل پڑنا اور بھول جانا کہ کچھ ہوا ہے۔ جیسے کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی تسلیتیں اور اتنی بے اقتنا تی! یک ایک کوئی افواہ جیسے دفتاً آندھی لوگوں کو آ لیتی ہے۔ پھر وہ پر ہمیلتا ہوا خوف و ہراس۔ پھر وہی تسلیتیں یہ رہ سوال کہ پاکستان میں کیا ہونے والا ہے؟ پھر اپنی راہ پل پڑنا اور بھول جانا۔ جیسے کچھ نہیں ہوا ہے، جیسے کچھ نہیں ہو گا۔ مگر کیا واقعی کچھ ہونے والا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ اگر کچھ نظر نہیں آتا تو یہ کچھ چل پڑنا۔ پھر وہی یادوں کی گھنی میں ملبا سفر۔ جب میں روپ نگہ میں تھا۔
میری زندگی کا دیلو مالا تی زمانہ پھر جب میں ویاس پور آیا۔ ویاس پور۔
«یہ مردہ جمل رہا ہے؟»

«ہمیں، یومِ گھٹت ہے اور جی یوم مردہ جو ہے یو جنڈہ ہے۔»

«چل جھوٹی رہا۔»

«رام کسوں جنڈہ ہے۔ اٹھ کے کھڑا ہو گیو ہے۔ رام! موری تو میا مرگی۔»

«اچھا پھر؟»

»فیر سے لیٹ گیو اور میاں وال سے بھاگ آتی۔«

»بھوٹی۔«

وہ پھل کے ایسے سکی بیان پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اب وہ بچہ ہتھواڑا ہی تھا۔ بی اماں کے گزر جانے اور روپ بگر سے نکل آئے کے بعد وہ جیسے ایک ساتھ بردا ہو گیا تھا، جیسے اس کا بچہن روپ بگر میں رہ گیا تھا۔ روپ بگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا پچھے کے رستے جو جاتے کہاں جا کر نکلتے تھے، اس درخت میں گم ہوتے تکھائی دیتے تھے۔ ذوق تھے ہمکو کے ہمکے اسکے، او نگھتی رنگتی بیل کاڑیاں، کوئی کوئی تو انابیلوں کی گزنوں کھلاتے اکے، او نگھتی رنگتی بیل کاڑیاں، کوئی کوئی تو رنگو کہ اس میں جنتے تو انابیلوں سے ایک میٹھے شور سے میں آؤں ان گھنٹیوں اور گھنٹکھوڈوں کی بولت وہ منٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے پھر جاتے۔ کلامندرا کا نہ کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیل، کملا کی ویران اور اداس فضیل، طیلے والا قلعہ، ناون بن، ناون بن کے بچ کھڑا بھید بھرا یہ گد، اسیں ایک پورا دیوالا تی عہد تھا جو روپ بگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔ یہاں ہر چند کہ سامنے مر گھٹ تھا اور مر گھٹ میں کھڑے گھٹے پیل کے پیڑیگر اسے وہاں کسی پریڑے کے اردوگرد بھید بھری فضا کا احساس نہیں پڑا، حالانکہ پھلوٹے وہاں بہت کچھ دیکھا تھا۔

»موکو تو بھیا چڑیل نے کیڑا لیو۔«

»چل پل بکواس مت کر۔«

»رام کسوں اور پیر یاٹیکم ٹیک۔ وے جو پیل دکھاتی دیوت ہے، وال کے تھے ایک کلھیا میں چون کا پتلا اور سیندھر اور تک کھاند۔ اور بڑھ کے تھے ایک بیر بانی دانت نکو سے ایسی کھلاؤ سے جیسے چلیں کھلاؤ سے ہے۔«

»بکواس مت کر، جا پنا کام کر۔«

وہ دیاں پور میں کچھ اور دکھیڑا تھا۔ ہمارے سڑکوں پر دوڑتے ہوئے رہتے تھے تانگے، بچ بچ بچ میں کوئی بکھی، کوئی موڑ کا رہ ان سڑکوں سے آگے بازاروں اور ٹھوڑی سے

پرے تارکوں والی وہ ٹکنی چکنی سرمنی سڑک جس پر دن بھر لاریاں دوڑتی رہتیں۔ ان سواریوں سے عجب سا شور پیدا ہوتا تھا۔ وہ آوازیں اب کہاں تھیں جو روپ نگر کی فضائیں بسی ہوتی تھیں۔ اب اس کے کام نئی آوازوں سے آشنا ہو رہے تھے۔ بھیوں اور تانگوں کی گھنیوں کی آوازیں۔ لاری کے ہارن کی آواز، موڑ کا رکس کے ہارن کی آواز اور سب سے عجب ریل کی سیٹی کی آواز جو سے روپ نگر سے دور سے آتی تھی اور ویاس پور سے پرے لئے جا رہی تھی۔ ان جلنے ان وکھیوں ہنڑوں کی طرف۔ دور پرے سے آتی ریل کی سیٹی کی آواز کے ساتھ وہ کوئی کی چھت پہ پہنچا۔ جہاں سے مرکھٹ کے اس ہفت پھیلی ہوئی ریل کی پڑی صاف دکھائی دیتی۔ ریل گاڑی دوڑ سے سیٹی دیتی اور دھوان الگتی آتی، پھر درختوں کی اوٹ میں دوڑتی رہتی۔ صرف اس کا دھوان فضائیں پھیلتا نظر آتا، پھر اچانک درختوں کی اوٹ سے وہ کالا مجھوڑا بخن بندوار ہوتا جو اپنے سے بھی فیادہ کالا دھوان آسمان کے درخ انگل رہا ہوتا اور اس کے یونچے سواریوں سے بھرے ان گنت ڈبے کس تیری سے یہ ڈبے گزرتے چلے جاتے اور دم کے دم میں نظر وہ سے او جھل ہو جاتے۔ وہ جیران رہ جاتا۔ پھر جب ابا جان کی بتائی ہوتی یہ بات اس کے دھیان میں آتی کہ یہ ریل گاڑی مراد آباد سے آ رہی ہے اور ویاس پور سے ہوتی ہوئی جا رہی ہے تو وہ اور جیران ہوتا۔

وہ یہاں خان بہادر تایا کی کوئی میں آکر رہا تھا جو آبادی سے کسی قدر دور کھینتوں اور باعوں کے بچھڑی بھتی کہ اس کی چھت پہ کھڑے ہو کر دیکھو تو سامنے مرکھٹ سے پسے ریل کی پڑی، ریل کی پڑی سے پرے افتن کی حدود پر قطار میں کھڑے ہوتے درخت۔ پھر جب وہ بازار جاتا تو ایک ایک دکان کو تجیب سے دیکھتا۔ کھڑکی بازار روپ نگر کی چھوٹی بزریا کے مقابلے میں لکھا بڑا بازار تھا۔ ایک دکان پر سائیکلیں ہی سائیکلیں۔ اتنی سائیکلیں اس نے کبھی کاہے کو دیکھی تھیں۔ سائیکلوں، جرتوں اور کھڑے کی کافوں

سے آگئے وہ ملبائچڑا چوک تھا جہاں جا بجا گیوں اور پاس کے اوپنے اوپنے ڈھیر لگے ہوئے شہنے اور آس پاس جنگلی کبوتروں کی پوری برات اُتری ہوئی تھی۔ دکانیں جن میں ال و اسیاب کچھ نہیں، پس چاندنی بچھی ہوئی، چاندنی پر سند، مند پر بیٹھا ہوا سیٹھ، اس کے آگے ٹیل فون رکھا ہوا۔ ایک ساتھ شور پڑتا اور ہر سیٹھ، ہر لالہ تیزی سے ڈاکل کھاتا اور فون پر زور زور سے باتیں کرتا۔ وہ شش در رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ پرشور اس وقت پڑتا ہے جب کسی جنس کا بھاؤ کھلتا ہے۔

بانار میں اتنا شور، کوہٹی کے آس پاس اتنی خاموشی! جب ریل کاٹھی آتی تب ہی یہ خاموشی ٹوٹتی۔ اس کے گزر جانے کے بعد پھر فاموشی اور دوستک پھیلی ہوئی ریل کی پڑی جسے وہ بچت سے کھڑا دیرتک حیرت سے تکدار ہتا۔ اس کی حریتیں بھی اب سفر کر کے کماں سے کھاں پہنچ گئی تھیں اور کس قدر دل گئی تھیں۔

خان بہادر تایا نے یہ کوہٹی یہ سوچ کر بنوائی تھی کہ وہ پیش ہو جانے کے بعد یہاں آگئے رہیں گے۔ رائے سینا میں عمر گزار نے کے بعد وہ ویاس پور کی گلیوں میں تو نہیں رہ سکتے تھے۔ لگہ وہ تو پیش ن پاشے سے پہلے ہی دنیا سے گزر گئے۔ یہ واقعہ اس کے ویاس پور کا نے سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔ اس نے خان بہادر تایا کو نہیں دیکھا تھا لگہ ویاس پور اگر پورے خاندان پران کی عظمت کے ساتے کو منڈلاتے دیکھا۔

”پھر جاتی خان بہادر رحومتے یہ تکیب کی کہ باعنی بن کے باعنیوں میں مل گئے ایسے زبردست باعنی بنتے کہ ان کی میکٹی کے صدر میں گئے مگن باعنیوں کے بھی جاسوس لگے ہوئے تھے۔ ایک جاسوس نے انہیں تاڑیا۔ یہ پچ میکٹی میں اس نے بھانڈا چھوڑ دیا کہ یہ شخص تو انگریزوں کا جاسوس ہے۔ پس پھر کیا تھا، باعنیوں نے بھائی جان پر سپول تان لئے۔“
”چھا جان بولتے بولتے رکے۔ اچھے بھائی، نیحیب بھائی، صاحب میاں سب بہت یکسوئی سے سن رہے تھے۔

”پھر کیا موابا؟“

”اجی جاتی خان مرحوم کب چکتے والے تھے انہوں نے اسی تقریب کی کہ باغیوں کے پستول اسی باغی کی طرف مڑکتے ہیں نے انہیں انگریزوں کا جاسوس تباہ تھا،“ چھچابان رکے پھر لوئے کہ

”دیہ باغی اتنے خطرناک تھے کہ بجا تی خان بہا در مرحوم نے انہیں شپکڑا، موتا تو وہ انگریزوں کا وہ حال کرتے جو سن ستادن میں ہوا تھا۔ دشست پسند تھے سارے ہندوستان میں انہوں نے ”تہلکہ ڈال رکھا تھا،“

خاندان میں جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی اور سب خاندان والے اکٹھے ہوتے تو بس ہچھا جان اسی طرح خان بہادر تایا کی باتیں شفرع کر دیتے تھے اور بیٹے، بھائیجے بھیجے اور دگہ دا کٹھے ہو جاتے اور اس طور سنتے جیسے کسی دیومالا لائی بیرد کے قصے سن سہے ہیں۔

”بجا تی خان بہادر مرحوم کی ایک ٹانگ چاندی کی تھی۔“

”چاندی کی ٹانگ؟“ بخوبی بجا تی نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں! بات یہ ہوتی کہ انہوں نے سلطانہ ڈاکو کا ہچھا کرتے کرتے چینی کا طی سے چھلانگ لگادی۔ ٹانگ کی ہڑی ٹوٹ گئی۔ پھر راتے سینا میں والسرتے کے سرجن نے ان کا علاج کیا اور پوری ٹانگ زکال کے چاندی کی ٹانگ لگادی۔“

سب بحیرت میں عرق ہو گئے۔ پھر بخوبی بجا تی نے پوچھا:

”و تو سلطانہ ڈاکو کو تایا جان نے پکڑا تھا؟“

”او! کس نے پکڑا تھا؟ بیگ صاحب کے تو والد اجد بھی آجائے تو سلطانہ کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ یہ بجا تی خان بہادر ہی کی ہمت تھی کہ اسے پکڑ لیا اور بیشین رومال والوں کو کس نے پکڑا تھا؟“

”ریشمین رومال والے؟ وہ کون تھے؟“

”ریشمین رومال والے کوں تھے؟“ چھا جان ہنسے:

”بیٹو تمہیں معلوم کیا ہے؟ ریشمین رومال والوں نے انگریز کا تحفہ اللہ کا پورا منصوبہ بنایا تھا۔ تفت و قت پہ بھائی خان بہادر مر جوم تھے تاڑا اور

ریشمین رومال بیچ میں سے اچک لیا۔“

دکے، پھر کہنے لگے:

”انگریزوں پہ بھائی خان بہادر مر جوم کے بہت احسانات ہیں۔ بجبا ہی

تو ان کے مر نے پہ والسرتے نے کہا تھا کہ خان بہادر کے مر نے سے میری

کمر ٹوٹ گئی۔“

”بھیا! اپنے اس بھتیجے سے بھی تو پوچھو کہ استے نایا کی طرح کچھ بننا ہے یا ڈنڈے

ہی بجائے میں۔“

”بیٹے ذاکر! جایدو، بھائی جان کیا پوچھر ہی میں؟ ایک بات ہم تمہیں بتاتے دیتے ہیں۔ بھائی خان بہادر اسانی سے خان بہادر نہیں بن گئے تھے۔ محنت انہوں نے سکتی کی تھی۔ جس محنت سے انہوں نے پڑھا تھا اس محنت سے آج کوئی پڑھ سکتا ہے؟ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ان کی الیٹین کا تسلیخ ختم ہو گیا۔ تسلیخ کی بوتل جا کے دیکھی تو وہ خالی پڑی تھی۔ انہوں نے کیا کیا کہ جگنو پکڑ کے بی اماں کے دو پیٹے کے آنچل میں پاندھے اور ان کی روشنی میں صحیح اذان کے وقت نکل پڑھتے رہے۔ آج کوئی اس بات کا لقین کہرے گا؟ مگر پھر اس محنت کا انہیں صلدہ ملار میرٹرک کے امتحان کا جیب نیچہ آیا تو وہ یوپی میں اول تھے۔“

محنت سے تو وہ بھی پڑھ رہا تھا۔ میرٹرک کا امتحان سر پر تھا۔ رات رات پھر الیٹین جلا تھے بیٹھا رہتا اور دن میں دن دن پھر سکول کے اعلانے میں کھڑے آم کے پیڑ کے نیچے پڑا تو اسے رہتا۔ امتحان کی تیاری کے لئے سکول بند تھا۔ کلاسوں کے کمرے

مغل، برآمدے غالی، تبلیڈ میں ستانہ پڑھنے کے لئے یہ کتنی سازگار فضائی۔ سکول کے
اکلوتے آم کی چھاؤں میں وہ اور سرپیدر دو توں بیسوئی سے پڑھتے رہتے۔ جب تھک
جاتے تو سامنے کی اس تار کوں والی سڑک کو تکنے لگتے۔ محسن پر کبھی کبھی کوئی لاری گزرتی نظر
آتی اور پھر سڑک خالی۔

”پتھر ہے یہ لاری کہاں جا رہی ہے؟“

سرپیدر نے اس سے پوچھا:

”کہاں جا رہی ہے؟“

”میر ٹھہر۔“

”میر ٹھہر؟ یہ لاری میر ٹھہر جا رہی ہے؟ تو نے میر ٹھہر دیکھا ہے؟ کیسیلئے میر ٹھہر؟“ اُس نے
ایک سالسہ میں لکھنے سوال کر دیا۔

میر ٹھہر کو اس نے پہلے سرپیدر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔
کالم سے فراغت پا کر وہ اور سرپیدر دو توں کمپنی باغ کی طرف پل پڑتے۔ چھافنی انگریزوں
کی دینا، لمبی خاموش چکنی چکنی سڑکیں، اور ویریختے درخون کے زیغ دوڑتک جاتی ہوئیں،
گم ہوتی ہوتیں۔ کوئی گورا سفید کرچ کے جوتے اور سقید نیکر قیص پہنے، ہاتھ میں ٹینس
کا بلا سچھالے، نیزی سے قریب سے گزرتا اور آگے جا کے کمپنی باغ کے گیٹ میں مڑ جاتا۔
سنہری بالوں، گورے سے چرسے والی کوئی ہم برابر سے گزرتی اور وہ دو توں حد نظر تک اس
کی گوری ننگی پنڈلیوں کو دیکھتے رہتے، پھر کوئی کالی آیا کسی دودھ جیسی زمگت ولے پکے
کو گاڑی میں بٹھلتے آہستہ آہستہ گاڑی کو دھکیلیتی چلی جاتی۔

”یاں سے؟“ سرپیدر چلتے چلتے رک کر کھڑا ہو جاتا۔ ”سن ستاؤں کا اندوں شروع
ہوا تھا۔“

”یاں سے؟“ وہ پکہ کر اس جگہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اس جگہ میں کیا غاص بات ہے؟